© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اشاعتِ گذشتہ میں ہم اُن بنیادوں پر گفتگو کر رہے تھے جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ پاکستان کا نظامِ زندگی تعمیر کرنا ممکن ہے۔ اس سلسلے میں جس چیز کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کو منبعِ ہدایت اور اوّلین ماخذِ قانون تسلیم کیا جائے۔ آج اِسی سلسلے کی بقیہ بنیادوں کو ہم اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔

دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہو سکتا ہے "جمہوریت" ہے۔ یہ خود قرآن و سنت کا منشا بھی ہے اور باشندگانِ ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ:

ملک کسی خاص شخص، یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں، لہٰذا اس کا انتظام اُن سب کی، یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے، اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کر سکیں۔

اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں بحث اس کی کسی خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی یہاں اختیار کی جاتی ہے اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگانِ ملک کی نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے، نہ اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہر حال ممکن نہیں ہے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔ ایسے نظام سے اگر دلچسپی ہو سکتی ہے تو اسی طبقے کو ہو سکتی ہے جس کی مرضی اس میں غالب ہو، اور ایک محدود طبقے کی دلچسپی تعرف یہ کہ کسی ملک کی فلاح و بہبود کی ضامن نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ رفتہ رفتہ عام لوگوں کی دلچسپی کی ضد ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ یہ تضاد ایک کشمکش میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اس نقصان دہ صورت حال میں مبتلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونے سے ملک کو بچانا ضروری ہے، اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، پہلے جمہوریت کے اصول کو صدقِ دل سے قبول کر لیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک ٹھیک کارفرما ہو۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جبکہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں، اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اُسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درسگاہ بالآخر اُسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جئیے جاتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے بھلے بُرے کی وہ خود ذمہ دار ہے اور اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بُری طرح چلنا اُس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اُس کا ہے، ملک کی بھلائی اور بُرائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے، اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی خطرات سے بچانے میں اپورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹر شپ یا امرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض تماشائی بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے ردّ و بدل یا بناؤ اور بگاڑ میں اُن کی رائے اور مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو عیب بھی نقائص ہوں، انہیں اس نقصانِ عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

پچھلے چند سال میں ہمارے یہاں جو حالات پیش آئے ہیں انہیں اس بات کی دلیل ٹھیرایا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس کے اور مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہاں جمہوریت تو ضرور ہونی چاہیے مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے۔ اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیر اندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اُن تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آئے ہیں تو کسی صاحب بصیرت کے لیے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہوگی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوئی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں، یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلّم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے بُرے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے، اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اُسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھیرایا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تو ہے استدلال کی غلطی۔ اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے، جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پُرامن طریقے ہی سے قائم ہو، بہرحال پُرامن طریقے سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداءً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں، بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو ــــ جمہور کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی ــــ اس طرح کا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے اُن نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے فطری نتائج ہیں؟ آمریت خواہ کتنی ہی خیر اندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے، اُس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں، اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔ وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔ وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جا سکے۔ وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔ اس میں ردّ و بدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے جنہیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔ اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آ سکے۔ اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو، انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔ مگر خلاصی کے جتنے پُرامن راستے ہوتے ہیں وہ انہیں چن چن کر بند کر دیتی ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلابات کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزلِ خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

اِن نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل ہو رہا ہو۔

اب اگر شرحِ صدر کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ ہمارے ملک کا نظام جمہوری ہی ہونا ہے، تو اس کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ہم جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ اختیار کریں اور اس میں آمریت کے لوازم و خصائص کی آمیزش نہ کریں، کیونکہ اس کے بغیر جمہوریت صحیح طریقے پر کام نہیں کر سکتی، نہ وہ نتائج دکھا سکتی ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ اس غرض کے لیے ہمیں جمہوریت کے ساتھ ساتھ پانچ مزید اصولوں پر بھی اتفاق کرنا ہوگا:۔

اول، تقسیمِ اختیارات کا اصول، یعنی ریاست کے تینوں شعبوں (انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ) کے دائرۂ اختیار کا واضح طور پر الگ ہونا۔

دوم، شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کی ضمانت، اور عدلیہ کا ان کے تحفظ پر قادر ہونا۔

سوم، انتخابات کی آزادی اور اس کی حفاظت کے لیے ایسی قانونی و انتظامی تدابیر جن سے یہ اطمینان ہو سکے کہ انتخابات کے نتائج فی الحقیقت رائے عام کے مطابق نکل سکیں گے۔

چہارم، قانون کی حکمرانی، یعنی یہ امر کہ راعی و رعایا کے لیے ایک ہی قانون ہو، اور سب اس کے پابند ہوں، اور عدالتوں کو یہ حق ہو کہ سب پر بے لاگ طریقے سے وہ اس کو نافذ کر سکیں۔

پنجم، ملازمینِ حکومت کا، خواہ وہ سول سروس سے تعلق رکھتے ہوں یا فوج سے، سیاست میں دخیل نہ ہونا اور ہر اس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کرنا جسے باشندوں کی اکثریت آئینی طریقے پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔

یہ پانچوں اصول ایک جمہوری نظام کے ایسے لوازم ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کر دیا جائے، یا ساقط نہ سہی ناقص ہی کر دیا جائے، تو جمہوریت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور پھر وہی خرابیاں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جو کسی نہ کسی نوع کی بے نقاب یا نقاب پوش آمریت سے رونما ہوا کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر اگر ملک کے انتظامی فرمانرواؤں کو یہ اختیارات حاصل ہوں کہ وہ کسی وقت جمہور کے نمائندوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو رخصت کر کے خود ہی حکومت بھی کرنے لگیں اور خود ہی اپنی مرضی کے قوانین بھی بنالیں، تو اس میں اور کھلی کھلی بادشاہی و آمریت میں آخر کیا فرق رہ جاتا ہے اور اس طرح جمہوریت کے نام سے فریب کاری کرنے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ یا اگر انتظامی فرمانرواؤں کو ایسے اختیارات حاصل ہوں کہ وہ عدالتوں کے ضمیر اور ان کی قدرتِ انصاف پر اثر انداز ہو سکیں تو اس حالت میں اور مطلق العنان جباری میں آخر کیا وجہِ امتیاز ہے؟ ایک جابرانہ نظام میں بھی تو یہی قباحت ہوتی ہے کہ وہاں طاقت ور کے مقابلے میں کمزور کا حق دلوانا عدالت کے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر ایک جمہوری نظام میں حکمرانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں لوگوں کی آزادیٔ ذات، آزادیٔ تحریر و تقریر، آزادیٔ اجتماع اور آزادیٔ نقل و حرکت سلب کر لیں بغیر اس کے کہ اُن کا جرم کسی عدالت میں ثابت کیا گیا ہو، اور بغیر اس کے کہ کوئی عدالت ان کے معاملے میں بہ تحقیق کرنے کی مجاز ہو کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں، تو ایسے نظام کا آغاز خواہ کیسے ہی جمہوری طریقے پر ہو، اس کا انجام لازماً جمہوریت کی موت پر ہوگا، کیونکہ جمہوریت کبھی ایسے ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتی جہاں حکومت پر تنقید کرنا دشوار، اور حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا دشوار تر ہو جائے۔ ایسی جگہ تو جو ایک دفعہ برسرِ اقتدار آجائے گا وہ پھر زبردستی اقتدار پر قابض رہے گا، اور اس کا نام بہر حال جمہوریت نہیں ہے۔

ایسا ہی معاملہ انتخابات کی آزادی کا بھی ہے۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ لوگ اپنی آزاد مرضی سے جس کو چاہیں حکمرانی کے لیے منتخب کریں، اور جب چاہیں اپنی آزاد مرضی سے ان کو تبدیل کر دیں۔ یہ چیز کیسے وجود میں آسکتی ہے اور کس طرح باقی رہ سکتی ہے اگر دباؤ اور لالچ اور فریب اور حیلوں سے انتخابات کے نتائج اصلی رائے عام کے بالکل برعکس برآمد کیے جا سکتے ہوں۔ ایسی حالت میں تو لوگوں کو رائے اور انتخاب کا حق دینا اور نہ دینا دونوں برابر ہیں۔

اسی کے قریب اہمیت اس چیز کی بھی ہے کہ ملک میں آئین و قانون اور ضابطہ سب کے لیے یکساں ہو، سب پر غالب ہو اور کوئی اس کی خلاف ورزی کرنے کا مجاز نہ ہو۔ یہ ان بنیادی خصوصیات میں سے ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ایک جمہوری نظام کو ایک شخصی استبداد اور ایک مطلق العنان آمریت سے ممیز کرتی ہیں۔ جہاں رعایا کے لیے قانون کچھ اور ہو اور ریاست کے لیے کچھ اور، یا جہاں قانون کی ساری پابندیاں صرف کمزوروں کے لیے ہوں اور طاقت والے بر وقت آئینی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی من مانی کر سکتے ہوں، یا جہاں عدل و انصاف کی طاقت زور آوروں کے مقابلہ میں قانون کو نافذ کرنے سے عاجز ہو، وہاں جمہوریت کبھی قائم نہیں ہو سکتی اور قائم ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ جمہوریت تو سب لوگوں کی برابری کا نام ہے۔ اور برابری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ضابطہ سب کے لیے ایک ہو اور سب پر یکساں نافذ ہو۔

پھر جمہوریت کی زندگی اور کامیابی کے لیے یہ چیز بھی نہایت ضروری ہے کہ حکومت کے کارپرداز اور محافظ سچے دل سے جمہوریت کے اصول کو تسلیم کریں، یعنی وہ اس بات کو مان لیں کہ ملک باشندوں کا ہے اور باشندوں کو یہ حق ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے جن لوگوں کو چاہیں اپنے ملک کا کارفرما بنائیں، اور مملکت کے کارپردازوں کا درجہ حقیقت میں باشندوں ہی کے ملازم کا ہے، ان کا فرض ہے کہ جن لوگوں کو بھی باشندوں نے کارفرما بنایا ہو ان کے تحت ملازم رہ کر کام کریں۔ یہ بات اگر ایمانداری کے ساتھ قبول نہ کی جائے اور ملازمین حکومت جتھہ بندی کر کے خود یہ طے کرنے لگیں کہ کن کارفرماؤں کو رکھنا ہے اور کن کو نہیں، یا کارفرمائی کی باگیں خود اپنے ہاتھوں میں لینے پر تل جائیں، تو صرف یہی نہیں کہ جمہوریت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی، بلکہ درحقیقت اخلاقی حیثیت سے یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے، اور نتائج کے اعتبار سے بھی ایسے ملک کے لیے ایک نہایت خطرناک چیز ہے۔ ایک شخص کے ملازم اگر مجتمع ہو کر اس شخص کو معزول کر دیں اور اس کے گھر بار کے مالک بن بیٹھیں تو اس کا نام غداری و خیانت کے سوا کچھ اور نہیں رکھا جا سکتا۔ جہاں پبلک کے ملازم پبلک کے ساتھ یہ معاملہ کریں وہاں اس حرکت کو اور کیا نام دیا جا سکے گا؟ [illegible] اس کے نتائج [illegible] کہ [illegible] ہیں کہ جہاں ایک مرتبہ ملازمین کو یہ چسکا لگ گیا [illegible] ایک [illegible] حصہ [illegible] تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اقتدار [illegible] کے لیے کشمکش شروع کر دیں گے، نیچے سے اوپر تک سب [illegible] جوڑ توڑ میں لگ جائیں گے [illegible] کبھار جمہوری انتخابات کے ڈھونگ [illegible] ان میں [illegible] بلکہ پس پردہ [illegible]

© rasailojaraid.com